15

دنیا کے نشیب و فراز انسان کے لئے قدرت کے اشارے ہیں کہ بڑھتے اور ترقی کرتے چلے جاؤ

آج دنیا کے پردے پر صرف جماعت احمدیہ ہی ہے جسے خدا نے اپنے عرش سے یہ کہا ہے کہ اُٹھ اور میں تجھے اٹھاؤں گا

(فرمودہ 9 مئی 1952ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے حسب ذیل آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت کی:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ۔ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ 1

اس کے بعد فرمایا:

"انسان کو اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی دولت غور و فکر کی عطا فرمائی ہے اور یہی وہ دولت ہے جو کہ انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان کی تعریف منطقیوں نے حیوانِ ناطق کے الفاظ میں کی ہے۔ جب منطق کی ابتدا ہوئی تو پہلے پہل لوگوں نے یہ سمجھا کہ انسان اور دوسرے جانوروں میں یہ فرق ہے کہ انسان بولتا ہے اور دوسرے جانور نہیں بولتے۔ لیکن آہستہ آہستہ

جب انہیں معلوم ہوا کہ بعض جانور بھی انسانی زبان سیکھ لیتے ہیں جیسے طوطے ہیں یا مینائیں وغیرہ ہیں، جب انہیں معلوم ہوا کہ جانوروں کی چیں چیں بھی اپنے اندر کچھ معنی رکھتی ہے، جب انہوں نے دیکھا کہ چیونٹیاں جب چل رہی ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو جو چیونٹی غلہ یا کوئی اَور چیز دیکھ کر ایک جگہ سے آ رہی ہوتی ہے وہ آنے والی چیونٹی سے ہاتھ ملاتی ہے اور وہ آنے والی چیونٹی سیدھی اُس جگہ چلی جاتی ہے جہاں غلہ ہوتا ہے اور اسے سنبھال لیتی ہے، جب انہوں نے دیکھا کہ شہد کی مکھیاں جہاں پھولوں کا ذخیرہ ہوتا ہے وہاں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کی راہنمائی سے شہد کے مخازن کا پتا لگا لیتی ہیں، جب انہوں نے اس قسم کے اشارات جانوروں میں دیکھے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ جہاں تک بولی کا تعلق ہے اس کے لحاظ سے تو آدمیوں کی بولی میں بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ کوئی انگریزی بول رہا ہے، کوئی فرانسیسی بول رہا ہے، کوئی جرمن بول رہا ہے، کوئی نارویجین بول رہا ہے، کوئی سویڈش بول رہا ہے، کوئی فنش بول رہا ہے، کوئی رَشین بول رہا ہے، کوئی پولش بول رہا ہے، کوئی عربی بول رہا ہے، کوئی سواحیلی بول رہا ہے، کوئی فینٹی (FANTI) بول رہا ہے، کوئی پنجابی بول رہا ہے، کوئی اردو بول رہا ہے، کوئی بنگالی بول رہا ہے، کوئی چینی بول رہا ہے، کوئی ملائی بول رہا ہے۔ غرض الگ الگ قسم کی سینکڑوں بولیاں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی اَور بولی ہوتی ہے اور دوسروں کی اَور۔ مگر باوجود اِس کے جب سب کو بولنے والا سمجھا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے حلق سے نکلنے والی بولی کو تو بولی کہا جائے اور پاؤں یا ہاتھ سے نکلنے والی بولی کو بولی نہ سمجھا جائے۔ آخر اپنے اپنے رنگ میں بندر بھی بولتے ہیں، چڑیاں بھی بولتی ہیں اور ان کی آوازوں میں اشارے ہوتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان اشاروں کے بعد جانور ایک خاص رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان تو بولتا ہے مگر جانور نہیں بولتے۔ جب منطقیوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے سمجھا کہ حیوانِ ناطق کی یہ تشریح غلط کی گئی ہے۔ تب انہوں نے ناطق کے اَور معنی کر لئے اور کہا کہ ناطق کے معنی یہ ہیں کہ وہ فکر کر کے نئی ایجادات کرتا ہے اور ترقی کی طرف اس کا قدم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پس حیوانِ ناطق کی آخری تشریح انہوں نے یہ کی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو بولتا ہے وہ انسان ہے۔ کیونکہ بولتے جانور بھی ہیں چاہے ان کی بولیاں اَور رنگ کی ہیں بہرحال چڑیوں میں، طوطوں میں،

کبوتروں میں، بلبلوں میں، سب میں کوئی نہ کوئی بولی پائی جاتی ہے۔

جو فرق ہے انسان میں اور اُن میں وہ یہ ہے کہ انسان فکر کر کے اپنے لئے ترقی کا ایک نیا میدان تجویز کر لیتا ہے اور وہ ہر فکر کے بعد پہلی سطح سے اونچا چلا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے جانوروں میں یہ بات نمایاں طور پر نہیں پائی جاتی۔ تھوڑی بہت ایجادیں ان میں بھی نظر آتی ہیں جیسے اُود بلاؤ2 ہیں۔ ان کے گھروں کی ساخت کو دیکھا جائے تو پہلے زمانوں کے لحاظ سے ان میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ کسی حد تک ان میں طب بھی پائی جاتی ہے۔ وہ زخمی ہوتے ہیں تو علاج کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابتدائے عالَم سے یہ بات ان میں چلی آ رہی ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ غور اور فکر کے بعد انہوں نے کسی حد تک ارتقاء کی طرف اپنا قدم بڑھایا ہے۔ ہم بچے تھے تو ہم نے ایک فاختہ ماری۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو مجھے اُس کے پیٹ پر کوئی سخت سی چیز معلوم ہوئی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس فاختہ کو کوئی زخم لگا تھا جس کو تنکے کی چھال کے ساتھ سیا گیا تھا۔ گویا جس طرح ڈاکٹر ایک گہرے زخم کو سیتا ہے اُسی طرح اُس فاختہ یا اُس کے کسی ساتھی نے اس زخم کو سیا تھا اور وہ زخم اُس وقت اچھا ہو چکا تھا۔ صرف تنکا باقی تھا۔ تو جانوروں میں بھی ایک حد تک ترقی تو ہے مگر وہ اتنی محدود ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اور انسان کی ترقی اتنی غیر محدود ہے کہ اس کی ترقی کے متعلق یہ اندازہ لگانا کہ وہ کس سُرعت سے ہو رہی ہے یہ بھی مشکل ہے۔ گویا جہاں جانوروں کے متعلق یہ پتا لگانا سخت مشکل ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی کی ہے یا نہیں وہاں انسان کے متعلق یہ اندازہ لگانا سخت مشکل ہے کہ وہ کتنا ترقی کر چکا ہے اور اس کا پہلا قدم کتنا پیچھے رہ چکا ہے۔ پس اصل چیز جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُس کی قوتِ فکر ہے۔ وہ غور کرتا ہے، وہ کائناتِ عالَم کے اسرار کے متعلق فکر کرتا ہے، وہ ان سے بعض نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر نتائج کے استنباط کے نتیجہ میں وہ اپنے فکر کی سطح کو، اپنے اخلاق کی سطح کو، اپنے ماحول کی سطح کو، اپنے تمدن کی سطح کو اور اپنے تعیُّش کی سطح کو اَور اونچا کر دیتا ہے۔ پھر وہ اَور زیادہ غور شروع کرتا ہے۔ پھر نئے زاویوں سے کائنات کے رازوں کی جستجو کرتا ہے۔ پھر وہ اَور زیادہ تحقیق اور تجسس سے کام لیتا ہے اور اس سطح کو اور زیادہ اونچا کر دیتا ہے۔ صرف نیک اور بَد میں، مومن اور کافر میں یہ امتیاز ہوتا ہے کہ ارتقائی قدم تو دونوں ہی اٹھاتے ہیں، ترقی کی طرف تو دونوں ہی جا رہے ہوتے ہیں اور قوتِ فکریہ کے لحاظ

سے دونوں ہی مُردہ بھی ہوتے ہیں اور زندہ بھی ہوتے ہیں۔ روحانی زندے روحانی دنیا میں اور جسمانی زندے جسمانی دنیا میں ترقی کر رہے ہوتے ہیں مگر اُن کی ترقی دو مختلف رنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔ روحانی انسان جب اونچا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے ملنے کے لئے نیچے اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ روحانی طور پر اونچائی اور بلندی سے نسبت دی جاتی ہے اور انسان کو نیچے کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ کیونکہ انسان ارضی ہے اور اللہ تعالیٰ سماوی ہے۔ یہ سب ایک تشبیہی زبان کے الفاظ ہیں۔ مگر ان کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں چلتا اور ہم یہ الفاظ بولنے پر مجبور ہیں۔ بہرحال جس وقت روحانی انسان ترقی کرتا ہے سماوی طاقتیں یعنی خدا اور اُس کے فرشتے نیچے کی طرف آنا شروع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ درمیان میں آکر خدا اور اُس کے بندے کا آپس میں اتصال ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان الفاظ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰى 3۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ سے ملنے کے لئے اوپر گئے اور خدا آپ سے ملنے کے لئے نیچے آیا اور درمیان میں آکر خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ مگر جو مادی لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی ترقی کا رنگ اِس سے اُلٹ ہوتا ہے۔ وہ جوں جوں اونچے جاتے ہیں خدا تعالیٰ اَور زیادہ اونچا ہوتا چلا جاتا ہے۔ روحانیت میں خدا تعالیٰ کا طریق دَنَا فَتَدَلّٰى والا ہے۔ جوں جوں روحانی انسان کائناتِ عالَم کے اسرار معلوم کرنے میں کامیاب ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے کے شوق میں اوپر کی طرف چڑھتا ہے خدا تعالیٰ بھی اُس سے ملنے کے شوق میں نیچے اُترنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر مادی لوگ جوں جوں اونچے ہوتے ہیں خدا تعالیٰ اس سے بھی زیادہ تیزی سے اونچا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ دس فٹ اونچے ہوتے ہیں تو بجائے خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کے خدا تعالیٰ اُن سے سو فٹ اَور پَرے چلا جاتا ہے۔ فرض کرو خدا تعالیٰ ان سے ایک ہزار فٹ کے فاصلہ پر ہے اور یہ لوگ دس فٹ فاصلہ طے کر لیتے ہیں تو بجائے اِس کے کہ خدا تعالیٰ اور ان کے درمیان نو سو نوے فٹ کا فاصلہ رہ جائے خدا تعالیٰ اور اُن کے درمیان ایک ہزار ایک سو فٹ کا فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ ترقی دونوں کرتے ہیں۔ زندہ دونوں میں ہوتے ہیں اور مُردہ بھی دونوں میں ہوتے ہیں۔ دینی لحاظ سے بھی بعض لوگ زندہ ہوتے ہیں اور بعض مُردہ اور مادی لحاظ سے بھی بعض مادی لوگ زندہ ہوتے ہیں اور بعض مُردہ۔ روحانیت میں مُردہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے

عالَم میں مُردوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور مادیت میں مُردہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے عالَم میں مُردوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں میں آجکل جتنے ذکر کرنے والے، زاویوں میں بیٹھ کر عبادتیں کرنے والے اور قرآن کریم پڑھنے والے لوگ ہیں وہ روحانیت سے یکسر خالی ہیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ذکرِ الٰہی نہیں کرتے۔ وہ اب بھی ذکر کرتے ہیں، وہ اب بھی مسجدوں میں عبادتیں کرتے ہیں، وہ اب بھی زاویوں میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں مگر انہیں خدا نہیں ملا۔ پس روحانی لحاظ سے وہ مُردہ ہیں۔ اسی طرح دنیوی لحاظ سے افریقہ کے وحشی قبائل یا ایشیا کے وہ ممالک جو تنزل میں گرے ہوئے ہیں وہ بھی دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر ایسے بے علم اور غافل ہیں کہ دنیوی ترقی کے لحاظ سے وہ مُردہ ہیں۔

اگر ہم یورپ کو دیکھیں، اگر ہم امریکہ کو دیکھیں، اگر ہم اُن کی ترقی کو دیکھیں اور اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کو دیکھیں تو یہ محض مُردہ نظر آتے ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ یہ لوگ دنیا کمانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وجہ یہ ہے کہ دنیا کمانے کے لئے جس غور اور فکر اور تدبیر کی ضرورت ہے اس سے وہ کام نہیں لیتے۔ اسی طرح روحانی عالم کے مولویوں اور پنڈتوں کو دیکھیں تو وہ محض مُردہ نظر آتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ دنیا میں لگے ہوئے ہیں بلکہ اس لئے کہ گو وہ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں مگر اس کے لئے جس غور اور فکر کی ضرورت تھی، کائناتِ عالَم کے جن اسرار کے معلوم کرنے کی ضرورت تھی، ارتقائی میدانوں میں جس سُرعت سے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی اس سے وہ یکسر غافل اور لاپرواہ ہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ۔ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ زمین و آسمان کی پیدائش اور لیل ونہار کا اختلاف یعنی اُس کا آگے پیچھے آنا☆ اس میں عقلمند لوگوں کے لئے بڑے بڑے نشانات ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ یہ دنیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی ہے اور آسمان بنایا ہے۔ یعنی کچھ سماوی طاقتیں ہیں اور کچھ ارضی طاقتیں ہیں، کچھ بلندیاں ہیں اور کچھ نشیب

☆ یہاں اختلاف سے مراد تفاوت نہیں بلکہ آگے پیچھے آنا ہے۔

ہیں ۔ان تمام چیزوں کو دیکھ کر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ آخر یہ چیز کسی نہ کسی غرض کے لئے بنائی گئی ہے ۔نشیب وفراز بتاتے ہیں کوئی ہمیں بلندی کا سبق دے رہا ہے،کوئی ہمارے دلوں میں قوتِ عملیہ کا شوق پیدا کر رہا ہے ۔جیسے تم نے گھروں میں اپنے چھوٹے بچوں کو یا بھائیوں کو اور بھتیجوں کے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ جب کوئی بچہ چلنے لگتا ہے تو ماں باپ یا بھائی وغیرہ روٹی کا کوئی ٹکڑا یا پھل یا پھول اُسے دکھاتے ہیں کہ کھڑے ہو کر ہم سے لے لو۔ بچہ اُسے دیکھتا ہے اور وہ کانپتے اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہوتا ہے ۔اس پر وہ اپنا ہاتھ ذرا پیچھے کر لیتے ہیں تا کہ بچہ ایک قدم آگے بڑھے اور اسے لینے کی کوشش کرے ۔ چنانچہ بچہ بڑی مشکل سے ایک قدم چلنے کی کوشش کرتا ہے ۔بعض دفعہ وہ گر بھی پڑتا ہے مگر پھر اُٹھتا ہے اور ایک قدم چل کر روٹی کا ٹکڑا یا پھل یا پھول لے لیتا ہے اور وہ خوش ہوتا ہے کہ میں نے بڑی کامیابی حاصل کر لی ۔اُس کے چند گھنٹہ بعد وہ پھر اُسے روٹی کا ٹکڑا دکھاتے ہیں اور بچہ سمجھتا ہے کہ ایک قدم پر یہ ٹکڑا مجھے مل جائے گا ۔مگر اب کی دفعہ ایک قدم پر اُسے وہ چیز نہیں دی جاتی بلکہ دو قدم اُٹھانے پر اُسے چیز دی جاتی ہے ۔اِسی طرح اُس کا حوصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے ۔اُس کی طاقت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ اتنی طاقت پیدا کر لیتا ہے کہ سینکڑوں میل تک چلتا چلا جاتا ہے ۔مسلسل نہیں بلکہ اگر اسے مہینہ دو مہینے یا سال بھر بھی پیدل سفر کرنا پڑے تو وہ کر لیتا ہے ۔ چنانچہ کئی لوگ ایسے ہوئے ہیں جن کی ساری عمر سفروں میں ہی گزر گئی ہے ۔اور انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے سفر کئے ہیں ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک دوست ہوا کرتے تھے ۔وہ میرے استاد بھی تھے ۔ انہیں حساب میں بڑا ملکہ تھا ۔مگر ساتھ ہی اُن کے دماغ میں بھی کچھ نقص تھا ۔ اُنہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ محمدی بیگم والی پیشگوئی اُن کے ذریعہ سے پوری ہوئی ہے اور اس وجہ سے وہ کئی ایسی حرکتیں کرتے رہتے تھے جو تکلیف دہ ہوا کرتی تھیں ۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عادت تھی کہ بات کرتے وقت بعض دفعہ اپنی ران پر ہاتھ مارتے تھے ۔حدیثوں میں بھی پیشگوئی آئی ہے کہ مسیح موعود فَـخِـذ پر ہاتھ مار کر بات کرے گا ۔4 بہر حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب کبھی مجلس میں بات کرتے ہوئے ران کی طرف ہاتھ لانا تو انہوں نے جَھٹ کُود کر آگے آجانا۔لوگوں نے پوچھنا آپ کو کیا ہوا؟ وہ کہتے تمہیں معلوم نہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے درحقیقت مجھے اشارہ کیا تھا ۔اس طرح مجلس میں بہت بدمزگی پیدا ہو جاتی ۔ ایک دفعہ

تنگ آ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ قادیان سے چلے جائیں۔ انہیں گو جنون تھا مگر بہر حال عشق والا جنون تھا دشمنی والا جنون نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے تو اَڑنا شروع کیا کہ میں نہیں جاتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عادت تھی کہ جب کوئی تحریر لکھتے نیچے ''خاکسار غلام احمد'' لکھا کرتے تھے۔ رقعہ اُنہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میرے ذریعہ سے ہی بھجوایا تھا۔ میں نے اُنہیں رقعہ دیا تو کہنے لگے میں نہیں جانتا مرزا غلام احمد ولد مرزا غلام مرتضٰی کون ہوتا ہے میں اس حکم کی اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے یہی بات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جا کر کہہ دی۔ آپ نے قلم اٹھایا اور اپنے نام کے آگے مسیح موعود لکھ دیا۔ میں پھر وہ رقعہ لایا تو دیکھ کر کہنے لگے اب تو بڑی مصیبت ہے اب تو قادیان سے جانا ہی پڑے گا۔ چنانچہ وہ چل پڑے۔ اُس وقت ظہر کا وقت تھا۔ ظہر کے وقت وہ نکلے اور پیدل چل کر جالندھر گئے۔ جالندھر سے ہوشیار پور گئے۔ ہوشیار پور جا کر پھر قادیان واپس آئے۔ مگر قادیان کے قریب پہنچ کر پھر گھبراہٹ میں امرتسر یا لاہور چلے گئے اور تیسرے دن صبح ان سب مقامات کا چکر لگا کر قادیان واپس آ گئے۔ اور کہنے لگے آئندہ میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا مجھے معاف کیا جائے۔ میں قادیان سے باہر نہیں رہ سکتا۔ غرض دو تین دن میں وہ قادیان سے جالندھر گئے۔ جالندھر سے ہوشیار پور گئے۔ ہوشیار پور سے واپس آ کر پھر امرتسر یا لاہور گئے اور پھر واپس قادیان آ گئے۔ گویا قریباً دو تین سو میل کا سفر انہوں نے طے کر لیا۔

ان کی انہی حرکتوں کی وجہ سے ایک دفعہ گورداسپور کے مقدمہ میں جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام وہیں تشریف رکھتے تھے آپ نے فرمایا یہ روز مجھے دق کرتے ہیں ان کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ دوست جو ساتھ تھے انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے ان سے کہا کہ قادیان سے ایک ضروری کتاب لانی ہے آپ جائیں اور کتاب لے آئیں۔ گورداسپور سے قادیان 16 میل کے قریب ہے۔ عشاء کے وقت وہ گئے اور رات کے بارہ بجے کتاب لے کر واپس آ گئے۔ لوگوں نے تو یہ تدبیر اس لئے کی تھی کہ کسی طرح ان کو وہاں سے نکالیں مگر وہ راتوں رات پھر واپس پہنچ گئے۔ اس پر دوست پھر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ وہ ہنس کر کہنے لگے مجھے پتا ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے کیوں بھجوایا تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ غرض بتیس میل سفر انہوں نے دو چار گھنٹوں میں کر لیا۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ اس

قدر سفر کے بعد وہ بارہ گھنٹے آرام کرتے ہوں بلکہ جب بھی انہیں کسی اَور کام کیلئے بھجوایا جاتا فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ تو دنیا میں بڑے بڑے تیز چلنے والے بھی پائے جاتے ہیں اور شدید ترین سُست اور غافل بھی پائے جاتے ہیں۔ وہی بچہ جس کو دو قدم چلنے پر روٹی یا پھل یا پھول انعام کے طور پر دیا جاتا ہے بعد میں ایک بڑا سیاح بن جاتا ہے اور دو تین سو میل دو چار دن میں پیدل سفر طے کر لیتا ہے۔ اب غور کرو اتنا تیز چلنے والا کون تھا؟ وہی تھا جو کل ایک قدم بھی انعام کے لالچ کے بغیر نہیں اٹھا سکتا تھا۔

تو اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ۔ انسان دیکھتا نہیں کہ زمین و آسمان میں ایک تفاوت پایا جاتا ہے۔ بلندی کے بعد بلندی اور اونچائی کے بعد اونچائی آتی ہے۔ یہ نشیب اور فراز، یہ پستی اور بلندی کیا چیزیں ہیں؟ یہ قدرت کے اشارے ہیں۔ اس امر کی طرف کہ بڑھتے چلے آؤ، ترقی کرتے چلے جاؤ۔ پہاڑوں پر ہم جاتے ہیں تو اسی طرح اس کی چوٹیوں پر پہنچتے ہیں۔ اگر یکدم دو میل سیدھا اونچا پہاڑ انسان کے سامنے آجائے تو اس کی ہمت پَست ہو جائے اور وہ اس پر چڑھنے کا نام بھی نہ لے۔ مگر اب کیا ہوتا ہے پچاس ساٹھ فٹ اونچا ایک ٹیلا ہمارے سامنے آتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ ٹیلا تو کچھ زیادہ اونچا نہیں آؤ ہم اس پر چڑھ کر نظارہ دیکھیں۔ چنانچہ ہم اُس ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں تو ایک دوسرا ٹیلا نظر آتا ہے۔ پھر ہم اُس پر چڑھ جاتے ہیں۔ اِس طرح قدم بقدم ہمارا دل لگتا چلا جاتا ہے اور چوٹی کے بعد چوٹی ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر بھی چڑھ جاتے ہیں جو 29 ہزار فٹ اونچی ہے گویا پانچ میل لمبی اس کی اونچائی ہے۔ اگر اتنی اونچی پہاڑی یہاں ربوہ میں ہی ہو تو کوئی شخص اس پر چڑھنے کی جرأت نہ کرے۔ لیکن تدریجی طور پر جب ایک بلندی کے بعد دوسری بلندی آتی ہے تو انسان سہولت کے ساتھ ان بلندیوں کو طے کر جاتا ہے۔ گویا ایک ٹیلا تحریک پیدا کرتا ہے دوسرے ٹیلے پر چڑھنے کی اور دوسرا ٹیلا تیسرے ٹیلے پر چڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے بچے کو پہلے ایک قدم پر روٹی کا ٹکڑا دیا جاتا ہے۔ مگر جب وہ ایک قدم پر چلنے کی استطاعت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو پھر اسے ایک قدم پر نہیں بلکہ دو قدم پر انعام دیا جاتا ہے اور اگر وہ ایک قدم پر

بھی روٹی یا پھل لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ماں باپ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتے ہیں۔ اسی طرح نیچر نے ہمارے سامنے ترقیات کا ایک غیر محدود میدان رکھا ہے مگر اس کے لئے تدریج اور ارتقاء کا پہلو ساتھ ساتھ رکھا ہے تا کہ شوق ترقی کرے انسانی ہمت بڑھے اور اس کا حوصلہ وسیع ہو۔ جب ترقی کا ایک قدم ہم طے کر لیتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے سب کچھ پا لیا لیکن وہاں پہنچتے ہی ایک اَور چوٹی نظر آتی ہے اور ہمیں کہا جاتا ہے ہمت کرو اور اس چوٹی تک پہنچو۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ایک دن ہم مونٹ ایورسٹ کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے ہیں، ہوتے ہوتے ہم نالوں اور دریاؤں اور سمندروں کو پار کر لیتے ہیں، ہوتے ہوتے ہم اپنی روحانی اور اخلاقی اور تمدنی مشکلات کو حل کر لیتے ہیں۔ مشکلات بھی کبھی انتہائی رنگ میں انسان کے سامنے نہیں آتیں۔ ہمیشہ قدم بقدم اس کے سامنے آتی ہیں اور وہ قدم بقدم ان پر غالب آتا چلا جاتا ہے۔ دنیا میں بڑی سے بڑی جنگ بھی ہو رہی ہو تو ایک دو سال کا بچہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ دنیا کے سامنے کون سی مشکلات ہیں۔ ایک چھوٹے بچہ کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ میں کسی طرح چند قدم چلنے لگ جاؤں۔ میں ابّا یا امّاں کا لفظ بول سکوں۔ لڑائیاں ہو رہی ہوں، ملک تباہ ہو رہے ہوں، جانیں ہلاک ہو رہی ہوں، بچے کے نزدیک اِس کی سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ میں ابّا اور امّاں کا لفظ صحیح بول لوں یا میں اپنی ٹانگوں سے ایک دو قدم چل لوں۔ آخر ایک دن آتا ہے کہ وہ ان مشکلات کو حل کر لیتا ہے اور اب اس کی عمر تین چار سال کی ہو جاتی ہے، اب اس کا ذہن پہلے سے زیادہ روشن ہوتا ہے اور اس کی مشکلات بھی پہلے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اب اس کی سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ الف اور ب لکھ لے۔ اس کی سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ قاعدہ یسرنا القرآن پڑھ لے۔ اب بھی وہ بائرن5 (Byron) کا کلام نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ٹینی سن6 (Tennyson) کے کلام کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتا، وہ کیٹس7 (Keats) کے کلام کو نہیں سمجھتا۔ وہ ورڈز ورتھ8 (Wordsworth) کے کلام کو نہیں سمجھتا یا ہمارے ملک کے لحاظ سے وہ غالب9 یا مومن10 یا ناسخ11 کا کلام سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک ٹینی سن (Tennyson) کے کلام کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ ناسخ اور غالب کا کلام اس کے نزدیک بے معنی ہوتا ہے۔ وہ سعدی12 اور حافظ13 اور عرفی14 کے کلام سے بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ

صرف اتنا جانتا ہے کہ میرے سامنے بڑی مشکل یہی ہے کہ مجھے الف ب لکھنا آ جائے۔ اور جب وہ الف ب لکھنے لگ جاتا ہے تو بے انتہاء خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے اپنا مقصد پا لیا۔ جب وہ الف ب اَبْ یا ب ت بَتْ لکھنے لگ جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ یا جب وہ ابّا یا امّاں کہنے لگ جائے تو بڑا خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تمام علوم پر میں نے قبضہ کر لیا ہے اور تمام مشکلات پر میں نے قابو پا لیا ہے۔ بلکہ جب پہلی دفعہ وہ پاجامہ پہننے لگتا ہے یا تہہ بند باندھنے لگتا ہے تو پاجامہ پہن کر یا تہہ بند باندھ کر بھی وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنی مشکلات کو حل کر لیا۔ اس کے بعد وہ آٹھ دس سال کی عمر میں پہنچ جاتا ہے اور اب اس کی مشکلات اَور زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں۔ اب اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے میں پرائمری پاس کر لوں۔ پھر اَور عمر بڑھتی ہے تو اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کچھ انگریزی آنی چاہیے، کچھ عربی آنی چاہیے، کچھ مسائلِ دینیہ سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ اُس وقت اگر اُسے نماز کا ترجمہ بھی سکھایا جاتا ہے تو معمولی۔ اِسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے چند موٹے مسائل اُسے بتا دیئے جاتے ہیں۔ دنیا کی مشکلات ابھی اُس کے ذہن میں نہیں ہوتیں اور نہ وہ اُن کے سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے۔ وہ امریکہ اور چین اور کوریا کے جھگڑوں سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ مجھے اے، بی، سی، ڈی آ جائے یا مجھے نہانا دھونا آ جائے۔ یا کوئی عیسائی ہے تو اُسے کھانے اور سونے کی دعا آ جائے۔ یہی مشکلات اُس کے سامنے ہوتی ہیں اِس سے زیادہ نہ وہ سوچ سکتا ہے اور نہ کسی بات کو سمجھنے کی اہلیت اور استعداد رکھتا ہے۔ پھر اِسی طرح وہ قدم بقدم چلتا چلا جاتا ہے اور دنیا کی مشکلات سے آگاہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بسا اوقات اپنے ایک مخصوص ماحول میں رہنے کی وجہ سے بڑی عمر ہو جانے کے باوجود وہ دنیا کی مشکلات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ کوئی چوہڑا ایک دفعہ لاہور کے قریب سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ سارے لاہور میں کہرام مچا ہوا ہے۔ دکانیں بند ہیں اور مرد عورتیں اور بچے سب رو رہے ہیں اور پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اُس دن مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت واقع ہوئی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کوئی متمدن بادشاہ نہیں تھا مگر چونکہ طوائف الملوکی کے بعد اس نے پنجاب میں حکومت قائم کی تھی اور سکھ قبائل کی طرف سے جو

مظالم ہو رہے تھے ان کو اُس نے دور کیا تھا اس لئے ہندو اور مسلمان سب اس سے محبت رکھتے تھے۔ پس ان لوگوں کے لئے جو لاہور کے رہنے والے تھے اور سیاسیات کو سمجھتے تھے اور جنہیں سکھوں کے انتہائی مظالم اور لوٹ مار کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امن میسر آیا تھا یہ صدمہ واقع میں پریشان کن تھا۔ لیکن چوہڑے کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں اُسے سکھوں نے لُوٹنا کیا تھا۔ مسلمانوں کے پاس دولت تھی اس لئے سکھ انہیں لُوٹا کرتے تھے۔ لیکن چوہڑا جو ایک گاؤں میں رہ رہا تھا اُس کا تو یہی کام تھا کہ ٹوکری اٹھائے اور گھر آجائے یا مزدوری کرے اور واپس آجائے۔ اور مزدوری کے لحاظ سے ایک ہندو بھی اسے من ڈیڑھ من بوجھ اٹھواتا اور ایک مسلمان بھی اسے اتنا ہی بوجھ اٹھواتا اور اس کے بعد اسے روکھی سوکھی روٹی اور پیاز دے دیتا یا چند پیسے دے دیتا اور وہ گھر چلا جاتا۔ پس اس کے نزدیک تو نہ پنجاب میں کبھی کوئی فساد ہوا تھا اور نہ کسی نے اسے دور کیا۔ اس نے جو اتنے بڑے لوگوں کو پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھا تو اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس طرح رو رہے ہیں؟ کسی نے کہا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ فوت ہو گیا ہے۔ اب اُس کے لئے یہ بات اَور بھی زیادہ تعجب خیز تھی کہ ایک آدمی کے مرنے پر اتنے آدمی رونے لگ جائیں۔ وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ پتا نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ باپو جیسے مر گئے تے رنجیت سنگھ بیچارے دی کی حیثیت ہے۔ یعنی جب میرے باپ جیسے لوگ مر گئے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ بیچارے کی کیا حیثیت تھی۔ گویا اُس چوہڑے کے نزدیک دنیا کی بہترین چیز یا نظم کو قائم رکھنے والی طاقت اُس کا باپ تھا کیونکہ وہ اپنے ماحول میں اس سے زیادہ حیثیت کسی چیز کی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اگر غور کریں تو رنجیت سنگھ کی حیثیت بھی دنیا کے مقابلہ کیا تھی۔

لاہور کے رہنے والے صرف اپنے ماحول کو دیکھتے تھے۔ ان کو بھی دنیا کے مستقبل یا دنیا کی طاقتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ ہوا ہے اُس وقت انگریزوں کی ایک کمپنی ہندوستان میں حکومت کر رہی تھی اور یورپین قوموں کو اتنی طاقت حاصل تھی کہ ان کی ایک بریگیڈ لاہور والوں کو شکست دے سکتی تھی۔ پس ان کے سامنے بھی صرف اپنی مشکلات تھیں۔ نہ یونائیٹڈ اسٹیٹس امریکہ کی طاقت ان کے سامنے تھی، نہ فرانس کی طاقت ان کے سامنے تھی، نہ جرمنی کی

طاقت ان کے سامنے تھی۔ صرف چند ڈاکوؤں کی لُوٹ مار اور ان کی غارت گری کے واقعات ان کے سامنے تھے۔ اور چونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کو دور کیا اس لئے ان کی نگاہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ بہت بڑا بادشاہ تھا۔ لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مطمحِ نظر اُس چوہڑے سے بہت اونچا تھا۔ اور ان سے یورپ اور امریکہ کے لوگوں کا مطمحِ نظر بہت اونچا تھا۔ وہ اس سے زیادہ سوچتے تھے جتنا لاہور والے سوچتے تھے۔ اور وہ اس سے زیادہ دنیا کی مشکلات کا علم رکھتے تھے جتنی مشکلات کا لاہور والوں کو علم تھا۔ پھر بھی وہ ان مسائل کو اس طرح نہیں سوچ سکتے تھے جس طرح اِس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے لوگ سوچ رہے ہیں۔ اِس زمانہ میں جس قسم کی توپیں نکلی ہیں، جس قسم کے ہوائی جہاز نکلے ہیں، جس قسم کے ہتھیار نکلے ہیں، جس قسم کا ایٹم بم ایجاد ہوا ہے ان ایجادات اور ہتھیاروں کی پہلے لوگوں کو کہاں خبر تھی۔ وہ سوچتے تھے تو اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق۔ اور اِس زمانہ کے لوگ سوچتے ہیں تو اپنے حالات کے مطابق۔ اگر اِس زمانہ کی ترقیات کا پہلے زمانہ کے لوگوں کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان باتوں کو ویسا ہی لغو سمجھتے جیسے اگر اُس چوہڑے کے سامنے چھ کارتوس والی رائفل کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں ایسی لغو بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔

غرض ہر ترقی مختلف تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ انسان اپنا حوصلہ قطعی طور پر ہار بیٹھے اور وہ کسی ترقی کو بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس چوہڑے کے لئے یہی ضروری تھا کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت کو دیکھتا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے دلّی کے بادشاہ رہتے تھے اور دلّی کے بادشاہوں کے سامنے وہ حکمران رہتے تھے جنہوں نے ان سے بھی زیادہ شاندار حکومت کی۔ اِسی طرح ہر ایک شخص سیکھتا چلا گیا اور چونکہ قدم بقدم ایک کے بعد دوسری چوٹی آئی اس لئے ہر ایک نے سمجھا کہ اس چوٹی کو سر کیا جا سکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۱﴾۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ کس طرح پستی کے بعد بلندی اور ہر بلندی کے بعد اَور بلندی آجاتی ہے۔ پستی کے نیچے اَور پستی پائی جاتی ہے اور بلندی کے اوپر اَور بلندی موجود ہے۔ تم گرتے ہو تو تمہیں پتا بھی نہیں لگتا کہ تم کہاں آ کر گرے ہو۔ اگر وہی حالت جو آج مسلمانوں کی

ہے بنوامیہ یا بنوعباس کے زمانہ میں یکدم مسلمانوں کی ہو جاتی ۔تو میں سمجھتا ہوں اس صدمہ کی شدت کی وجہ سے اُن کی جانیں نکل جاتیں اور وہ سارے کے سارے مرجاتے ۔مگر آج وہ خوش ہیں ان میں کوئی بے چینی نہیں ۔کوئی بے کلی نہیں سوائے چند سیاسی لوگوں کے باقی سب سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طبعی حالت ہے جو ان پر وارد ہوئی ہے ۔حالانکہ اگر ہم غور کریں اور مسلمان کی اُس طاقت کو سمجھیں جو کسی زمانہ میں اس کو حاصل تھی تو اُس کا آج تنزل اتنا خوفناک ہے کہ اس کا تصور کر کے بھی دل بیٹھنے لگتا ہے ۔ایک زمانہ مسلمانوں پر وہ گزرا ہے جب ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی یہ سمجھتا تھا کہ میرے پیچھے میری قوم کی بہت بڑی طاقت ہے ۔جرمنی آج کل عارضی طور پر دبا ہوا ہے لیکن جس زمانہ میں جرمنی طاقتور تھا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ جرمن بھی اگر چین میں جاتا یا جاپان میں جاتا بلکہ اگر جرمنی کا ایک چوہڑا بھی وہاں چلا جاتا تو وہ سمجھتا تھا کہ مجھے چھیڑنا کوئی آسان کام نہیں میرے پیچھے جرمنی کی توپیں ہیں میرے پیچھے جرمنی کے ہوائی جہاز اور جرمنی کی فوجیں ہیں ۔یہی حال امریکہ کا ہے ۔امریکہ کا ایک معمولی سے معمولی آدمی بھی دنیا کے کسی خطہ میں چلا جائے لوگ اس پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے ہیں ۔کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی پُشت پر امریکہ کی توپیں ، امریکہ کے جہاز اور امریکہ کی فوجیں ہیں ۔لیکن ہندوستان کا ایک نواب بھی وہاں جاتا تھا تو ڈرتا تھا کیونکہ سمجھتا تھا کہ میری پُشت پر کوئی طاقت نہیں ۔غرض یہاں کا نواب بھی باہر جا کر ڈرتا ہے ۔مگر طاقتور حکومتوں کا چوہڑا بھی باہر جاتا ہے تو اکڑ کر چلتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے کہ میرے پیچھے میری قوم کے جہاز اور توپیں ہیں ۔اور میرے پیچھے میری قوم کی طاقت ہے اور اسی چیز نے اس کی عزت اور رتبہ کو قائم کیا ہوا ہے ۔یہی حال کسی وقت مسلمان کا تھا ۔آج پاکستان آزاد ہے مگر چونکہ ابھی پورے طور پر اس کی طاقت مضبوط نہیں ہوئی اس لئے پاکستان کا رہنے والا خواہ جرمنی چلا جائے یا انگلستان چلا جائے یا فرانس چلا جائے یا چین اور جاپان میں چلا جائے اسے وہ عزت حاصل نہیں ہوتی جو ایک امریکن یا انگلستان کے رہنے والے کو ہمارے ملک میں حاصل ہوتی ہے ۔کیونکہ ایک امریکن کے پیچھے امریکہ کے جہاز اور امریکہ کی فوجیں اور امریکہ کی توپیں کھڑی ہیں ۔لیکن ایک مسلمان کے پیچھے یہ چیزیں نہیں ہیں ۔اس لئے دنیا ایک امریکن کی عزت کرتی ہے ، ایک انگلستان کے رہنے والے کی عزت کرتی ہے لیکن ایک مسلمان کی

عزت نہیں کرتی۔ مگر یہی چیز دنیا کے پردہ پر کسی وقت مسلمان کو حاصل تھی۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت کا مسلمان بھی جب باہر نکلتا تھا تو دنیا کی طاقتیں جانتی تھیں کہ گو یہ مسلمان اَن پڑھ ہے، مزدور ہے لیکن اگر ہم نے اس مسلمان کو چھیڑا تو چین سے لے کر اُندلس تک ساری اسلامی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔

سیلون سے ایک قافلہ آتا ہے اور ہندوستان میں لوگ اسے لُوٹ لیتے ہیں، کچھ عرب عورتیں بھی قید ہو جاتی ہیں اور وہ کسی کے ذریعہ سے عراق میں پیغام بھجواتی ہیں کہ عرب عورتوں کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے ناموس کے تحفظ کا تم سے مطالبہ کرتی ہیں۔ اُس وقت بنوامیہ کی ایران سے ایک طرف اور سپین سے دوسری طرف جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اچانک یہ پیغام پہنچتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک قافلہ لُوٹا گیا ہے اور کچھ مسلمان قید کر لئے گئے ہیں۔ بادشاہ نے کہا اِس وقت ہمارے سامنے ایک بہت بڑی مُہم ہے میں اِس وقت کسی اَور طرف توجہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جب اسے یہ پیغام دیا گیا کہ ان قید ہونے والوں میں کچھ مسلمان عورتیں بھی تھیں جنہوں نے اپنے ناموس اور اپنی عزت کے تحفظ کا ملک سے مطالبہ کیا تھا تو بادشاہ یکدم کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ باوجود موجودہ جنگوں کے لشکر فوراً ہندوستان کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ مسلمان لشکر ہندوستان میں پہنچا اور وہ اُس وقت تک واپس نہیں گیا جب تک اس نے اس ملک کو فتح نہیں کر لیا مگر یہ تو طاقت کے زمانہ کی بات تھی۔ جب مسلمان اپنی شاندار حکومت قائم کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں جب مسلمان بالکل گر چکے تھے، خلافت صرف نام کی باقی رہ گئی تھی، اسلامی خلیفہ صرف بغداد کا خلیفہ کہلاتا تھا، عرب کی الگ حکومت قائم ہو چکی تھی، حلب کی الگ حکومت قائم ہو چکی تھی، مصر کی الگ حکومت قائم ہو چکی تھی، خراسان کی الگ حکومت قائم ہو چکی تھی گویا مسلمان حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی صرف خطبوں میں خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ خدا فلاں عباسی خلیفہ کی شہرت کو بڑھائے اور اس کی عزت کو قائم کرے لیکن عملاً ہر علاقہ میں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں۔ خلافت کا اقتدار مِٹ چکا تھا، صلیبی جنگیں شروع ہو گئی تھیں اور عیسائی پھر مسلمان ممالک کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کی فوجیں فلسطین میں اتر رہی تھیں اور عَکّہ انہوں نے فتح کر لیا تھا۔ اُس وقت ایک مسلمان عورت کو عیسائیوں نے پکڑ

لیا۔ وہ عورت ان پرانے جاہل طبقہ کے لوگوں میں سے تھی جو انگریزوں کے زمانہ میں بھی یہ خطبہ پڑھا کرتے تھے کہ خدا ہمارے بادشاہ جہانگیر کی عزت بلند کرے۔ وہ بے چاری بھی ایسی ہی تھی اُسے پتا نہیں تھا کہ خلیفہ کیا ہوتا ہے۔ صرف اس نے سُنا ہوا تھا کہ مسلمانوں کا ایک خلیفہ ہوتا ہے اور اس کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جب اس عورت کو گرفتار کرنے کے لئے عیسائیوں نے ہاتھ ڈالا تو اس خیال کے ماتحت کہ مجھے کیا ڈر ہے جبکہ ہمارا ایک خلیفہ موجود ہے۔ اس نے زور سے آواز دی کہ میں خلیفہ سے اپنی فریاد کرتی ہوں۔ اُس وقت ایک مسلمان قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا اُس نے یہ آواز سنی اور ہنستے ہوئے وہاں سے چل پڑا کہ یہ عورت کیسی بیوقوف ہے اِسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہمارے خلیفہ کی آجکل کیا حالت ہے اور وہ اس کی کچھ مدد بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔ چلتے چلتے قافلہ ایک دن بغداد پہنچا۔ قافلہ کے پہنچنے پر شہر کے تمام لوگ اکٹھے ہو گئے اور باتوں باتوں میں پوچھنے لگے کہ سفر کی کوئی عجیب بات سناؤ۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ سب سے بڑا عجوبہ ہم نے یہ دیکھا کہ ایک مسلمان عورت کو عیسائیوں نے پکڑ لیا تو وہ عورت بلند آواز سے کہنے لگی کہ میں خلیفہ سے اپنی فریاد کرتی ہوں حالانکہ ہمارا خلیفہ تو بغداد سے بھی نہیں نکل سکتا اور وہ شام میں بیٹھی ہوئی خلیفہ کو اپنی مدد کے لئے بلاتی ہے۔ یہ لطیفہ شہر میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ پھیلتے پھیلتے دربارِ خلافت میں بھی پیش ہو گیا۔ کسی شخص نے خلیفہ وقت سے کہا کہ اِس طرح شام کے علاقہ میں ایک مسلمان عورت کو عیسائیوں نے گرفتار کر لیا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ جب وہ گرفتار ہوئی تو اُس نے بلند آواز سے کہا کہ میں خلیفہ کو اپنی مدد کے لئے پکارتی ہوں۔ خلافت اُس وقت مٹ چکی تھی، اسلامی حکومت تنزل میں جا رہی تھی لیکن ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ بادشاہت کی بُو بھی ان کے دماغ سے اُڑ گئی ہو۔ جب یہ روایت خلیفہ کے سامنے بیان کی گئی تو وہ عباسی بادشاہ اپنے تخت سے فوراً نیچے اُتر آیا اور اُس نے کہا خدا کی قسم! اگر اس مسلمان عورت نے مجھ پر اعتبار کیا ہے تو میں بھی اب واپس نہیں لوٹوں گا جب تک کہ اس عورت کو آزاد نہ کرا لوں۔ اُس وقت مسلمان گو متفرق ہو چکے تھے مگر خلافت سے محبت ابھی کچھ باقی تھی اور اسلام کی طاقت کی یاد ان کے ذہنوں میں تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس مُردہ اور سڑے گلے جسم میں بھی زندگی کا خون دوڑنے لگ گیا ہے تو سارے شہر میں ایک آگ لگ گئی۔ بغداد پندرہ بیس لاکھ کا

شہر تھا، ہزاروں ہزار مسلمان کھڑا ہو گیا اور انہوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم واپس نہیں لَوٹیں گے جب تک مسلمان عورت کو آزاد نہ کرا لیں۔ جب یہ خبر اردگرد پھیلی تو وہی آزاد حکومتیں جو اس بات پر خلیفہ سے جھگڑ رہی تھیں کہ تم کون ہوتے ہو ہم پر حکومت کرنے والے! ہم آزاد ہیں اُنہی کی طرف سے پیغام آنے شروع ہو گئے کہ ہم اپنی فوجیں آپ کی مدد کے لئے بھجوا رہے ہیں۔ چنانچہ اسلامی لشکر گیا اور عیسائیوں سے لڑا اور اس عورت کو آزاد کرا لیا تو ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان اتنی بڑی طاقت کا مالک تھا مگر آج مسلمان کی یہ حالت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل اس کو سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہی کیفیت جو آج مسلمانوں کی ہے۔ یکدم ان پر وارد ہو جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید ان میں سے ایک بھی نہ بچتا ساروں کی جان نکل جاتی۔

ہٹلر کو دیکھ لو چونکہ وہ یکدم گرا تھا اس لئے خودکُشی کر کے مر گیا۔ اُس سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ کُجا میری یہ حالت تھی کہ مجھے جرمنی پر حکومت حاصل تھی اور حکومت بھی استبداد والی اور کُجا یہ کہ اب مجھے روسیوں اور امریکنوں کی غلامی اختیار کرنی پڑے گی۔ یہ چیز اُس کی طاقتِ برداشت سے باہر ہو گئی اور وہ مر گیا۔ اِسی طرح ہزاروں ہزار واقعات دنیا میں نظر آتے ہیں کہ جب لوگوں کی طاقتِ برداشت سے کوئی بات بڑھ گئی تو وہ خودکشی کر کے مر گئے۔

پس میں سمجھتا ہوں کہ اگر یکدم مسلمانوں کی یہ حالت ہو جاتی تو شاید کچھ ہی لوگ جو بہت ہی بے غیرت ہوتے بچ جاتے باقی سب کے سب مر جاتے۔ اگر مامون اور امین کے زمانہ سے حالات یکدم گر کر آج کی حالت پیدا ہو جاتی تو نوے بچانوے فیصدی مسلمان تو ضرور اس صدمہ سے مر جاتے۔ وہ خودکشی تو نہ کرتے کیونکہ خودکشی اسلام میں منع ہے مگر وہ مر ضرور جاتے۔ لیکن چونکہ وہ آہستہ آہستہ گرے، باپ کی حالت سے بیٹے کی حالت کمزور ہو گئی اور بیٹے کی حالت سے پوتے کی حالت گر گئی اس لئے ان میں طاقتِ برداشت بھی پیدا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج مسلمان اِس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ اِس کی عزت اور ناموس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اِس کے کہ آج ہماری جماعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو ترقی کا ایک نیا موقع بخشا گیا ہے ان میں وہ بیداری نہیں پائی جاتی جو زندہ اور فعّال جماعتوں میں پائی جانی چاہیئے۔ ان میں وہ جنون نہیں پایا جاتا جو دنیا کو کھا جانے والی قوموں میں پایا جاتا ہے۔ ان

میں مُردنی چھا چکی ہے۔ وہ عادی ہو چکے ہیں ذلت کے، وہ عادی ہو چکے ہیں رسوائی کے، وہ غلامی کی کڑیوں کو اپنے لئے زیور سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر لدے ہوئے بوجھ کو اپنے لئے عزت کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے ان میں وہ بیداری نہیں، وہ عزم نہیں، وہ بے چینی نہیں جو حقیقی ذلت کے پہچاننے والے انسانوں میں ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنا مامور بھیجتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ قوم اب پچھلی مصیبتوں کی عادی ہو چکی ہے۔ اب ان کے دلوں میں اگلی امیدیں پیدا کرو تا کہ یہ مُردہ قوم پھر زندہ ہو سکے۔

یہی فرق ہے مولویوں میں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے ماموروں میں۔ مولوی ہمیشہ پچھلی مصیبتیں یاد دلاتا ہے اور اس طرح قوم کے ارادوں کو پَست کرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا مامور ان کے دلوں میں نئی امیدیں پیدا کر کے انہیں آئندہ کی ترقی کے لئے ابھارتا ہے۔ اور انہیں بتاتا ہے کہ تم طاقتور ہو، تم دنیا پر غالب آنے کے لئے پیدا کئے گئے ہو، تم آگے بڑھو کہ دنیا کی قوموں کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں آنیوالی ہے۔ لیکن بوجہ ایک پرانی عادت کے پڑ جانے کے ہزاروں ہزار لوگ ایسے ہیں جن کو جھنجھوڑنا پڑتا ہے، جن کو جگانا پڑتا ہے، جن کو بیدار کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ پھر سو جاتے ہیں، وہ پھر گر جاتے ہیں، وہ پھر سُست اور غافل ہو جاتے ہیں۔

پس حقیقت یہی ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ سمجھدار انسان کے لئے اس دنیا کے پردہ پر ہزاروں بیداری کی چیزیں ہیں۔ کسی کے لئے یہ امر بیداری پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے کہ میں گر کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور کسی کے لئے یہ امر بیداری پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری ترقی کے لئے کہاں تک سیڑھیاں لگا رکھی ہیں کہ میں ان سیڑھیوں کے ذریعہ زمین سے نکل کر آسمان تک پہنچ سکتا ہوں۔ غرض کسی کے لئے رات ہدایت کا موجب ہو جاتی ہے اور کسی کے لیے دن ہدایت کا موجب ہو جاتا ہے اور یہ رات اور دن کا چکر چلتا چلا جاتا ہے۔ قدرت کے قانون کے مطابق راتوں کا آنا بھی ضروری ہے اور دنوں کا آنا بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر رات کو دن سے بدلا جا سکے تو کون ہے جو یہ پسند نہیں کرے گا کہ میرے کام کا زمانہ لمبا ہو اور میری غفلت اور سونے کا زمانہ کم ہو۔ ہم مانتے ہیں کہ دن بھی ضروری ہے اور رات بھی ضروری۔ لیکن سوال یہ

ہے کہ اگر دن لانا ہمارے اختیار میں ہوتو ہم کام کے وقت رات کو لائیں گے ہی کیوں؟ ہم تو یہی چاہیں گے کہ کام کا زمانہ لمبا ہو۔ عقلمند انسان جو قشر کو نہیں دیکھتا بلکہ مغز پر نگاہ رکھتا ہے، جو ظاہر کو نہیں بلکہ باطن کو دیکھتا ہے اس کی اصل توجہ ہمیشہ اپنے حکام کی طرف رہتی ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اسے کام کے بدلہ میں کچھ تنخواہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس چیز کے پیچھے میں لگا ہوا ہوں وہی میری روٹی، وہی میرا کپڑا اور وہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ واقع یہی ہے کہ انسان روٹی سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے کلام سے زندہ رہتا ہے۔ دنیا میں دو قسم کی روٹی ہوتی ہے۔ ایک وہ روٹی ہوتی ہے جو سینکڑوں سال کے لئے مل جاتی ہے اور ایک وہ روٹی ہوتی ہے جس کے لئے صبح بھی محنت کرنی پڑتی ہے اور شام کو بھی۔ قرآن کریم میں عیسائیوں کے متعلق ذکر آتا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح ناصریؑ سے کہا کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں وہ مائدہ دے جو آسمان سے نازل ہو15۔ اس کے معنی بھی یہی تھے کہ وہ ہمیں روحانی بادشاہت عطا کرے۔ کیونکہ روحانی بادشاہت میں ایک ایسی چیز ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور جس کے حصول کے بعد صبح و شام کی محنت جاتی رہتی ہے۔ اسی لئے وہ قومیں جو مذہب کے ذریعہ دنیا میں ترقی کیا کرتی ہیں اُن کے لئے صبح و شام کی محنت جاتی رہتی ہے کیونکہ وہ دنیا کی حاکم ہو جاتی ہیں، دنیا کے خزانے ان کے ہو جاتے ہیں اور انہیں بے محنت آپ ہی آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزی مہیا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب روحانی بیداری ختم ہو جاتی ہے تو جیسے موسیٰؑ کے بعد ہوا اور جیسے عیسیٰؑ کے بعد ہوا اور جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوا پھر وہ قوم سزا پاتی ہے اور ہر شخص اپنے کئے کا نتیجہ بھگتتا ہے۔

تمہارے اندر بھی اِس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی روح پیدا کی گئی ہے۔ تمہارے لئے بھی ایک نیا مقصد مقرر کیا گیا ہے۔ تمہارے لئے بھی ایک نئی زندگی پیش کی گئی ہے۔ امریکہ کو باوجود اُس کی ساری طاقت کے کوئی یہ کہنے والا نہیں کہ اُٹھ! اور میں تجھے اٹھاؤں گا۔ انگلستان کو باوجود اتنا طاقتور ملک ہونے کے کوئی یہ کہنے والا نہیں کہ اُٹھ! اور میں تجھے اٹھاؤں گا۔ اسی طرح جرمنی، فرانس، سپین، روس، چین، جاپان اور ہندوستان کو کوئی یہ کہنے والا نہیں کہ اُٹھ! اور میں تجھے اٹھاؤں گا۔ صرف ایک احمدی جماعت ہی اِس دنیا کے پردہ پر ایسی ہے جسے خدا نے اپنے

عرش سے یہ کہا کہ اُٹھ! اور میں تجھے اٹھاؤں گا۔ اگر ہم پھر بھی نہیں اٹھتے تو ہم سے زیادہ بدبخت اَور کون ہوسکتا ہے۔'' (الفضل 6 جون 1952ء)

1: آل عمران: 191، 192

2: اُودبلاؤ: بلی سے مشابہہ ایک جانور جو دریاؤں کے کنارے رہتا اور مچھلی مینڈک کھاتا ہے۔ بیوقوف آدمی

3: النجم: 9

4: **القول المختصر فی علامات المھدی المنتظر لابی عباس الھیتمی** صفحہ نمبر 40 مکتبہ سید احمد شہید لاہور

5: **بائرن**: (Byron) (1788ء-1824ء) انگریزی کا رومانی شاعر۔ 1798ء میں لارڈ کا موروثی خطاب پایا۔ یونان اور سپین کا سفر کیا اور واپس آکر یونان کی جنگ آزادی کے حق میں نظم لکھی۔ (وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''لارڈ بائرن'')

6: **ٹینی سن**: (Tennyson) (1809ء-1892ء) پورا نام Alfred Tennyson تھا۔ انگریز شاعر جس کی سب سے مشہور نظم ''Inmemoriam'' تھی۔ یہ ایک طویل مرثیہ تھا جو شاعر نے اپنے دوست کی وفات پر لکھا۔ اسی سال شاعر کو ''ملک الشعراء'' کا خطاب ملا۔ اسی طرح ٹینی سن کو لارڈ کا خطاب بھی دیا گیا۔ (وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''الفریڈ ٹینی سن'')

7: **کیٹس**: (Keats) (1795ء-1821ء) انگریزی ادب کا ایک عظیم شاعر۔ اس کی خوبصورت شاعری حسوں کو متاثر کرتی ہے۔ پورا نام John Keats ہے۔ (وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''جان کیٹس'')

8: **ورڈزورتھ**: (William Wordsworth) (1770ء تا 1850ء) برطانیہ کا ایک مشہور رومانی شاعر تھا۔ 1843ء سے اپنی وفات تک برطانیہ کا ''ملک الشعراء'' رہا۔ انگریزی ادب میں رومانیت کا آغاز کرنے والے دو ابتدائی شعراء میں سے ایک تھا۔ (وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف۔ زیر لفظ ''ولیم ورڈزورتھ'')

9: **غالب**: (مرزا اسداللہ خاں غالب) (1797ء تا 1869ء) اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ 1850ء میں بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔ (وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''مرزا اسداللہ غالب'')

10: **مومن**: (مومن خان مومن) (1800ء تا 1851ء) مومن بچپن سے ہی ذہین طبع تھے،

حافظہ بہت اچھا تھا چنانچہ عربی و فارسی، طب و نجوم اور موسیقی میں جلدی کمال حاصل کرلیا۔ اصنافِ شاعری میں قصیدہ، رباعی، غزل، ترکیب بند، مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی ہے۔ مومن نہایت آزاد مزاج، قانع اور وطن پرست تھے۔

(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''مومن خان مومن'')

11: ناسخ: (امام بخش ناسخ) (1776ء تا 1838ء) مغل دور کے مشہور اردو شاعر تھے۔

(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''امام بخش ناسخ'')

12: سعدی: (شیخ سعدی) مصباح الدین شیخ سعدی آج سے تقریباً 800 برس پہلے ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک بہت بڑے معلم مانے جاتے ہیں۔ آپ کی دو کتابیں گلستان اور بوستان بہت مشہور ہیں، گلستان نثر کی کتاب اور بوستان نظم کی کتاب ہے۔

(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف ''زیر لفظ ''شیخ سعدی'')

13: حافظ: (حافظ محمد شیرازی) فارسی شاعر حافظ شیرازی کی زندگی کا زمانہ 726 سے 792 ہجری شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ کی زندہ جاوید تصنیف اس کا دیوان ہے جو غزلیات، قصائد، قطعات اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں حافظ نے تفسیر قرآن بھی تحریر کی۔ محمد گل اندام کے نزدیک حافظ شیرازی نے کشاف اور مصباح کے حواشی بھی تحریر کئے۔

(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''حافظ شیرازی'')

14: عرفی: (عرفی شیرازی) 16 ویں صدی کے مشہور فارسی شاعر تھے۔ یہ شیراز ایران میں پیدا ہوئے اور ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے درباری شاعر رہے۔ آپ کا شمار ہندوستانی انداز میں فارسی کے سب سے مستند شعراء میں ہوتا ہے۔

(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ ''عرفی شیرازی'')

15: اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ (المائدۃ: 113)